محمد حنیف ندوی

تاثرات

تاریخ اسلامی کے تین خلا

یوں تو ہماری تاریخ کا ہر ہر باب مطلع الانوار ہے۔ علم و فکر کے پرچم ہم نے لہرائے۔ تہذیب و تمدن کی سمتیں ہم نے بدلیں۔ اور دوسری قوموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کے اعلیٰ نمونے ہم نے پیش کئے۔ مگر تاریخ اسلامی کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن پر ہم ہرگز فخر نہیں کر سکتے۔ اسلام سے زیادہ جمہوری اقدار کا حامی اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے جس نہج اور اسلوب سے خلافتِ راشدہ کی طرح ڈالی، اور جس منصفانہ و عادلانہ طریق سے انسانی مشکلات کو حل کیا اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مگر بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ یہی خلافت ملوکیت پر منتج ہوئی۔ اور حکومت و اقتدار کے دائرے اسلام کے پیش کردہ شورائی رنگ کو اختیار نہ کر سکے۔ یہ مانا اس وقت اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ اس ابتدائی دور میں ذہنوں میں جمہوری حکومت کا کوئی واضح نقشہ موجود نہ تھا۔ یہ بھی تسلیم کہ ہماری شخصی حکومتوں کا مقابلہ اگر اس دور کی دوسری شخصی حکومتوں سے کیا جائے، تو ہماری یہ حکومتیں بدرجہا بہتر ثابت ہونگی۔ تاہم یہ حقیقت کتنی تلخ ہے کہ چودہ صدیوں کے اس طویل عہدِ ملوکیت میں کوئی جماعت، کوئی تنظیم اور اجتماعی احتجاج نہیں پایا جاتا کہ جس سے معلوم ہو سکے، کہ مسلمان ملوکیت سے بیزار ہیں۔ اور حکومت کی اس شکل کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔

اسی طرح انسان دوستی، اور انسانی تکریم و اعزاز کے سلسلہ میں قرآن و سنت کی تصریحات کس درجہ واضح ہیں۔ عیسائی دنیا جب انسان کو گنہ گار ٹھہرا رہی تھی۔ اور یونانی حکماء تک نے جب غلامی کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اس وقت اسلام نے انسانی وقار میں یہ کہہ کر چار چاند لگا دئے۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم میں عنداللہ بہتر وہ ہے جو زیادہ پاکباز ہے۔ یہی نہیں عملاً ایسی کوششیں کیں۔ اور غلاموں کے حقوق و فرائض کی اس انداز سے تعیین کی کہ آہستہ آہستہ یہ لعنت کم از کم اسلامی معاشرہ کی حد تک ختم ہو جائے۔

مگر یہ بات کس درجہ افسوسناک ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں اس کی ایک مثال بھی تو نہیں ملتی کہ ہم نے کبھی بھی غلامی کو ختم کر دینے کے لئے کوئی جدوجہد کی ہو۔ اس کو انسانیت کی جبینِ آبرو پر کلنک کا ٹیکہ سمجھا ہو۔ اور فقہی و شرعی حیثیت سے اس کو ختم ہو جانے کے لائق تصور کیا ہو۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب

جبکہ انسان کا اجتماعی ضمیر جاگ اُٹھا ہے۔ اور دنیا بھر کی شائستہ قوموں نے اس کو جُرم قرار دے دیا ہے۔ اب بھی مرکزِ اسلام میں غلاموں کا اسی طرح کاروبار ہوتا ہے، جیسے یہ انسان نہیں گائے، بیل اور بھیڑ بکری ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب بھی ہمارے فقیہانِ بے توفیق کو انسانیت پر ترس نہیں آیا اور اُنہوں نے اس کو ناجائز نہیں مانا۔ بلکہ اگر کوئی شخص اسلام کی اس دعوتِ توقیرِ بنی آدم کو عام کرتا ہے۔ اور اس زمانے میں غلامی کے کاروبار کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں سمجھتا۔ تو اسے ملحد و زندیق کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سبحان اللہ۔ مذہب جو انسانی شرف و ناز کو چمکانے آیا تھا۔ اس کا ایک استعمال گویا اس کی تذلیل بھی ہے۔

سوشل سروس یا انسانی معاشرہ کی خدمت پر بھی اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ اور جا بجا اس کی اہمیّت واضح کی ہے۔ کہیں مظلوم کی حمایت پر اُبھارا ہے، کہیں نادار و مفلس اشخاص کی مدد و اعانت کو بہت بڑا ثواب قرار دیا ہے اور کہیں اس بے کس اور ستم رسیدہ مخلوق کے ضعف و ناتوانی کے پیشِ نظر جس کو ہم عورت ذات کہتے ہیں ہمیں توجہ دلائی ہے۔ اور ان آبگینوں کے بارہ میں حسنِ سلوک کی تائید کی ہے۔ یعنی کوئی گوشہ معاشرتی زندگی کا ایسا نہیں، کہ جو اصلاح طلب ہو، اور اسلام نے اس کی اصلاح کا مشورہ نہ دیا ہو اور اس سے متعلق واضح تعلیمات کا نقشہ نہ پیش کیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے صوفیاء اور شاعروں کے ہاں جس درجہ انسانیت پر مبنی تصوّرات پائے جاتے ہیں۔ وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ لیکن ہماری تاریخ کا ایک بہت بڑا خلا یہ بھی ہے کہ ہم فقہی و کلامی بحثوں میں تو اُلجھے رہے، اور حربِ عقائد کے معرکوں کو تو سر کرتے رہے۔ مگر اسلامی معاشرہ میں جو رخنے، اور بگاڑ پیدا ہو گئے ہیں، ان کی طرف ایک تحریک، ایک تنظیم اور باقاعدہ جدوجہد کی حیثیت سے کبھی ملتفت نہیں ہوئے۔

غرض تنقید نہیں محاسبہ ہے۔ ملوکیت ختم ہو گئی اور ساری دنیا میں آہستہ آہستہ جمہوری رجحانات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس لئے ہمارے معاشرہ کے لئے اس میں کم از کم کوئی خطرہ پنہاں نہیں۔ یہی حال انسانی غلامی کا ہے۔ انسان اتنا خوددار، عزّتِ نفس کا حامی اور اونچا ہو گیا ہے۔ کہ اب یہ اس پستی کو شاید ہی کبھی قبول کر سکے۔ یوں بھی صنعتی ارتقاء اور سائنس کی ترقی کی بدولت غلاموں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گویا تاریخ کے اس خلا کو بھی تاریخ ہی کی تیز رفتاریوں نے پُر کر دیا ہے۔ اس میں ہمارے لئے خوشی اور ناز کا پہلو بلاشبہ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم نے چودہ سو برس ادھر اس کو ملیا میٹ کرنے کی کوئی کوشش کی ہوتی۔ یا کم از کم فقہ و قانون کے حدود تک ہی اس کو انسانی وقار و ناموس کے خلاف مانا ہوتا۔ افسوس اور شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کر پائے۔ خیر اب اس پر ماتم کرنے کا بھی موقع نہیں۔ یہ لعنت خود بخود ختم ہو گئی ہے۔ اور اگر ہمارے نہایت ہی مقدس مرکز میں یہ موجود ہے۔ تو علم کے ارتقاء اور جمہوریت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کو بہر حال ختم ہونا ہے۔ کیوں؟

اس لئے کہ فکری اور عملی اعتبار سے دلائل کا کوئی سہارا اب قائم نہیں رہا کہ جو اس کو استواری عطا کر سکے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی بُرائی کا بُرائی ہونا واضح ہو جاتا ہے تو پھر اس کا برقرار رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو اس کے کہ اسمیں تسکینِ نفس کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو۔

یہ دو مسئلے اس بنا پر ناقابلِ اعتناء ہیں، کہ ہمارا معاشرہ فی الحال ان سے دوچار نہیں۔ ہمارا اصل اور آج کا مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ کی اس کوتاہی کی تلافی کے لئے اس وقت بھی کوئی تیار نہیں۔ سب سے پہلے علماء سے بجا طور پر توقع ہو سکتی تھی کہ ان میں کچھ نیک نفس لوگ اپنی زندگیوں کو وقف کرینگے۔ اور ایسے اداروں اور انجمنوں کی بنیاد رکھیں گے، جن کا مقصد مسلمانوں کی خدمت ہوگا، ان کی اصلاح ہوگا، اور ان میں اجتماعی و اخلاقی شعور کو بیدار کرنا اور پروان چڑھانا ہوگا۔ مگر ان کا یہ حال ہے کہ وہی فرسودہ بحثیں، وہی پُرانے جھگڑے اور عقائد و فکر کی لڑائیاں ہیں، کہ جو ان کی پوری صلاحیتوں کو مفلوج کئے ہوئے ہیں۔

دوسرے درجہ پر امراء اور اربابِ ثروت سے اُمید کی جا سکتی تھی کہ پاکستان بن جانے کے بعد جب ان کی مفلسی دور ہو گئی ہے۔ دولت کا مینہ برس رہا ہے اور لاکھوں کے وارے نیارے ہیں۔ تو ان کو اللہ تعالےٰ توفیق مرحمت فرمائیگا۔ کہ بڑے بڑے رفاہی کاموں کی پشت پناہی کریں۔ اور ملک کی اصلاح و تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ مگر ان سے متعلق بھی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی ہوسِ زر ہنوز سیر نہیں ہو پائی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ہل من مزید کے جہنّم سے یہ کب نکلیں گے۔ اور کب ملک و قوم کی تعمیری ضروریات کی طرف متوجہ ہونگے۔

مغربی ممالک میں ہزاروں اور لاکھوں ایسے اشخاص ہیں کہ جب زندگی کے تیس چالیس سال ملازمت و تجارت کے کامیابی سے گذار دیتے ہیں، تو بقیہ زندگی کو کسی بڑے معاشرتی مقصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور مادیت کے اس دَور میں بھی ایسی ایسی روحانی و انسانی خدمات اور کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں کہ جن پر بے اختیار رشک آتا ہے۔ اور تقلید کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے خدمت و اصلاح کا ایسا کوئی نمونہ پایا نہیں جاتا۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ہمارے ملک میں ایسے فارغ البال لوگوں کی کمی ہے۔ یا ایسے آسودہ حال اور سمجھدار حضرات کا فقدان ہے۔ جو آسانی سے معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اور اصلاح و ارتقاء کے سلسلہ میں سرگرمی سے حصّہ لے سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے۔ کہ خدمت و اصلاح کے لئے ذہنوں کو تیار نہیں کیا جاتا۔ اور ہماری تعلیم و تربیت کے کسی مرحلہ پر بھی ان اقدار کی اہمیت ذہنوں میں بٹھائی نہیں جاتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کسی شخص کے سامنے بھی یہ نصب العین نہیں ہوتا۔ اور کوئی شخص بھی اس طرح نہیں سوچتا کہ اگر اللہ تعالےٰ نے مجھے دنیا کے مکروہات کی طرف سے ایک گونہ یکسوئی عطا کی اور اطمینان بخشا تو میں معاشرہ کی فلاں فلاں خدمت سرانجام دونگا۔